Dareecha-e-Tahqeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 6, Issue 1
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹرارشد محمود ناشاد

صدر، شعبۂ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

فکرِ اقبال میں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی معنویت

Dr. Arshad Mahmood Nashad
Chairman Department of Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Justification Of "Shikwa" And "Jawab e Shikwa" in Iqbal's Thought

Allama Iqbal was a great poet and thinker of the twentieth century. He used poetry as one of the most important tools for the awakening of the Muslim Ummah. In Urdu and Persian he devised a new vocabulary and a new style to present his wise and philosophical thoughts. Initially, he adopted the traditional style of poetry and took the discipleship of a great poet like Dagh Dehlvi. But very soon he abandoned this style of poetry. After returning from Europe, there was a complete change in style.The first successful poem of this changed style and style can be called "Shikwa". In "Shikwa", the desperation and helplessness of the Muslims was attributed to God's indifference. In "Shikwa" the style of boldness is naturally dominant. In it, the services of Muslims have been highlighted, from which the people of God have benefited. In "Jawab e Shikwa", it is said that the dialogue is from God, so his style is different. In this, the complacency of the Muslims, their aversion to hard work and their negligence have been blamed for their present situation.When Iqbal wrote "Shikwa", a storm arose against him and many Mullahs also imposed fatwas of disbelief on him, but when Iqbal wrote "Jawab-e-Shikwa", people started to hide their faces and from their first thoughts, they began to move, in which Iqbal was challenged. These two great poems are very central in Iqbal's thought. The importance of these two poems is reflected in all the later poetry of Iqbal. In this article, an attempt has been made to trace the causes and factors of the creation of these two poems and to determine their status.

Key words: Allama Iqbal, 20th century, Shikwa, Jawab e Shikwa, Iqbal's Philosophy, Muslim in Sub Continent, Mullahs,

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں واضح شکست نے برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کو نڈھال اور شکستہ دل کر دیا اور وہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو کر عملی طور پر زندگی کے منظر نامے سے دُور ہٹتے چلے گئے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لیے ہندوستان میں جبر واستبداد اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ مسلمانانِ ہند انگریزوں کے ستم کا اولین ہدف تھے، اس لیے کہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور انھیں ڈر تھا کہ مسلمان کہیں مجتمع ہو کر پھر اقتدار کے حصول کے لیے آمادۂ عمل نہ ہو جائیں۔ سو، انگریزوں نے مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے، ان کو اسلام کے چشمۂ صافی سے کاٹنے اور ان کے بدن سے روحِ محمدی نکالنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ عیسائی مشنری مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے اور اسلام کی حقانیت کو گہنانے کے لیے قریہ قریہ گھوم رہے تھے اور سادہ لوح مسلمانوں کو خوش حال زندگی اور سرکاری ملازمتوں کا لالچ دے کر انھیں دھوکے سے عیسائی بنانے میں سرگرمِ عمل تھے۔ مسلمانوں کے دینی پیشوا ان حالات میں بالکل منفعل اور بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ بعض دینی پیشوا مسلمانوں کو انگریزوں سے دُور رہنے کی تلقین تو شد و مد سے کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر ان حالات سے نکلنے کا کوئی حل پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہیں۔ اس گھمبیر صورتِ حال میں کئی مسلمان زعما سامنے آئے جنھوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کی سعی و کوشش کی۔ سرسید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے اکابر مسلمانوں کی نجات کا سب سے اہم ذریعہ جدید تعلیم کو گردانتے تھے، اس لیے انھوں نے جدید تعلیم کی طرف مسلمانوں کو مائل کرنے کی بہت سعی کی۔ یہ اکابر چوں کہ انگریزی

حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے، اس لیے یہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنے کی تاکید و تلقین کرتے رہے اور ان کے دلوں سے انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو کم کرنے کے لیے ہمیشہ سر گرمِ عمل رہے۔ اکبر الہ آبادی بھی انگریزی حکومت کا حصّہ تھے مگر انھوں نے کھل کر تہذیبِ مغرب کی مخالفت کی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو نشانۂ طنز بنا کر مسلمانوں کو ان کی اندھی تقلید سے بچنے کا درس دیا۔ اکبر کی توانا آواز نے انگریزی تہذیب کی طرف والہانہ انداز سے لپکنے والوں کے قدم روک لیے۔

اسی عہد میں ملتِ اسلامیہ کے درد میں ڈوبی ایک اور منفرد آواز اُبھری۔ یہ آواز مولانا الطاف حسین حالیؔ کی تھی۔ حالیؔ، سر سید احمد خاں کے رفقا میں سب سے زیادہ ملت کا درد رکھنے والے رہنما تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی اس حالتِ زار پر خون کے آنسو بہائے اور ادبار کی اس فضا سے انھیں نکالنے کے لیے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان '' مد و جزرِ اسلام'' کی صورت میں پیش کی۔ مولانا حالیؔ کی ملت دوستی، درد مندی، دل سوزی اور اخلاص کیشی میں کچھ کلام نہیں تاہم اس سب کے باوجود ان کا مسدس مسلمانوں میں تیقن اور اُمید کی جوت جگانے میں ناکام رہا۔ وہ قوم کا مرثیہ بن گیا اور مسلمان پہلے سے زیادہ یاسیت اور قنوطیت کا شکار کر رہ گئے۔ مسلمانوں کو بے یقینی، بے عملی اور ناامیدی کی اس فضا سے نکالنے کے لیے قدرت نے خطۂ پنجاب سے ایک مردِ قلندر کا انتخاب کیا جس کے پیغام نے دلوں میں ولولۂ تازہ بیدار کر کے انھیں زندگی کے قافلے میں شامل ہونے کی قوت عطا کی۔ یہ مردِ قلندر علامہ محمد اقبال تھے، جنھوں نے اپنے شعر و ادب اور فکر و فلسفے سے مسلمانانِ ہند کے تنِ مردہ میں نئی روح پھونکی۔

علامہ محمد اقبال بلاشبہ نابغۂ روز گار شخصیت تھے۔ انھوں نے بہ یک وقت شاعری، فلسفہ، مذہب، کلام، سیاست، معیشت اور معاشرت کے شعبوں کو اپنے افکار کی جولانی سے متاثر کیا۔ انھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سفر آغاز کیا؛ ان کی ابتدائی شعر گوئی روایت کے بطن سے پھوٹی مگر بہت جلد وہ تقلید و جمود کے اس ماحول سے باہر آنے لگے۔ دُنیا کی بڑی زبانوں کے ادب کے بسیط مطالعے اور مشرق و مغرب کے گہرے مشاہدے نے ان کے رنگ سخن کو یک سر بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے تغزل کو فلسفے کی گہرائی اور فلسفے کو تغزل کی سرشاری عطا کر کے شعر و ادب کی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اقبال نے امتِ مسلمہ کو ذلت و نکبت اور زبوں حالی کی فضا سے نکالنے کے لیے شاعری کو بہ طور ایک ذریعے کے استعمال کیا۔ علامہ محمد اقبال نے نظم و نثر میں متعدد مقامات پر اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے، جن سے متبادر ہوتا ہے کہ جیسے اُنھوں نے اپنے شاعر ہونے کی نفی کی ہے، جیسے:

☆ نہ زباں مری غزل کی نہ غزل سے آشنا میں

☆ مرا یاراں غزل خوانے شمردند

☆ وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

مکاتیب میں بھی کئی مقامات پر ایسے بیانات ملتے ہیں مگر ایسے خیالات کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ شاعری کے اوصاف و کمالات میں الجھ کر کہیں اصل پیغام سے غافل نہ ہو جائیں۔ اقبال جتنے بڑے مفکر اور فلسفی تھے اس سے کہیں بڑھ کر شاعر تھے اور ان کے کلام کا ایک بڑا حصّہ اس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' اقبال کی شعر گوئی کے تشکیلی دور کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد تخلیق کیں۔ '' شکوہ'' لاہور میں پہلی بار انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ میں پڑھی گئی، یہ جلسہ اپریل ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا اور ''جوابِ شکوہ'' جنگِ بلقان کے غازیوں اور زخمیوں کی امداد کے لیے ۱۹۱۲ء میں موچی دروازہ، لاہور کے باہر جلسۂ عام میں پڑھی گئی۔ دونوں نظموں کے سامعین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور ان نظموں نے بلاشبہ مسلمانانِ ہند کے سینوں میں ہل چل پیدا کر دی۔ یہ نظمیں بلاشبہ ہماری ملی اور قومی تاریخ میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ نظمیں اقبال کی عاجلانہ کوشش و کاوش نہیں بلکہ ان کی تخلیق اقبال کے کئی سال کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' اگرچہ دو مختلف نظموں کی صورت میں پیش کی گئیں اور بانگِ درا کی ترتیب کے وقت بھی انھیں دو الگ الگ نظموں کے طور پر شامل کیا گیا مگر اصل میں یہ ایک ہی نظم ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ مکالمہ اور دوسرا جوابِ مکالمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''''شکوہ'' میں ہی ''جوابِ شکوہ'' کے وہ مضمرات و ارشادات موجود ہیں جو بعد میں ایک مستقل نظم کی صورت میں رو پذیر ہوئے، چناں چہ ''شکوہ'' کا زورِ بیاں ''جوابِ شکوہ'' کے پنہاں نکات کی شدت کے سبب ہی ہے، اسی لیے جب وہ نکات نظم کی شکل میں عیاں ہوئے تو پہلی تخلیق کا منطقی نتیجہ نظر آئے، خود شاعر نے مکالمے کا انداز اور جواب کی تکنیک ملحوظ رکھتے ہوئے گویا پہلی تخلیق کے جوابی مضمرات نکتہ بہ نکتہ نکال کر رکھ دیے ہیں۔'' (۱)

اقبال اگرچہ ڈراما کی صنف کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اس میں فرد کو اپنی شناخت گم کر کے کردار کے سانچے میں ڈھلنا پڑتا ہے مگر اس کے باوجود ڈرامے کے عناصر سے انھوں نے اپنی نظموں کی بافت میں بہت زیادہ کام لیا ہے۔ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' میں بھی ڈرامائی عناصر موجود ہیں جو ان نظموں کے حسن اور تاثیر میں مسلسل اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

'' شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' اقبال کی اولین نظمیں ہیں۔ان نظموں کی تخلیق سے قبل بھی اگرچہ بعض نظموں میں ایسے عناصر دکھائی دیتے ہیں جو اقبال کی فکر کی شناخت میں مدد دیتے ہیں مگر ان کی حیثیت محض عناصر کی سی ہے۔اقبال کی فکر پہلی بار مکمل صورت میں ان نظموں میں اظہار کرتی ہے۔یہ نظمیں جہاں اقبال کے فکر کی غماز ہیں وہاں اس کے فنی اور تکنیکی اسلوب کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔اس میں شک نہیں کہ اقبال نے بعد میں جو نظمیں تخلیق کی وہ فکر و فن کی بلندیوں کا مظہرِ اتم ہیں،خاص طور پر ''ذوق وشوق''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''طلوعِ اسلام'' وغیرہ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان عظیم نظموں کے پیکر میں بھی ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ نظموں میں ہی نہیں بالِ جبریل کی غزلیں تک ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے جلال و شکوہ سے پوری طرح مستنیر اور منشعب ہیں۔

نظم ''شکوہ'' میں اقبال نے مسلم تاریخ کو نہایت عمدگی کے ساتھ نظم کیا ہے۔مولوی احمد دین نے لکھا ہے کہ ''تابِ سخن کی جرأت آموزی اور فکرِ رسا کی شوخ طبعی نے ''شکوہ'' ترتیب دیا ہے۔''(۲) مسلمانوں کے کارناموں اور اوصاف و کمالات کا تذکرہ اس ترتیب کے ساتھ کیا ہے کہ خود بہ خود شکوے کا رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ نظم مسلمانوں کے جذبۂ توحید،جذبۂ جہاد،جذبۂ مساوات،جذبۂ یگانگت،جذبۂ خودداری و خودگری،جذبۂ اخلاص و ایثار،جذبۂ حمیت،جذبۂ سعی و عمل اور جذبۂ ایمان و ایقان کے مناظر کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ قلب و نظر کی دُنیا روشن ہو جاتی ہے۔''شکوہ'' کے حوالے سے صوفی غلام مصطفی تبسم کا یہ کہنا درست نہیں:

''نظم 'شکوہ' ایک بچے کی فریاد ہے جو کبھی جائز اور کبھی ناجائز طریق پر روتا ہے اور ہنگامہ برپا کرتا ہے۔اس کی چیخ پکار کے تقاضوں میں کوئی منطقی ربط یا جذباتی تسلسل نہیں ہوتا۔وہ اپنے شور و غوغا سے محض بڑوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا اور اپنی بے چارگی کو منوانا چاہتا ہے۔مسدس کے چھے مصرعی بند،بچے کی فریاد کے بے ربط ٹکڑے ہیں جنھیں وہ بغیر کسی التزام کے جوڑتا چلا جاتا ہے۔''(۳)

صوفی تبسم بلاشبہ فکرِ اقبال کے اہم شارح اور بلند مرتبہ ادیب و شاعر ہیں،تاہم '' شکوہ'' کے بارے میں ان کا متذکرہ بالا نقطۂ نظر کسی صورت بھی قابلِ قبول نہیں۔''شکوہ'' نہ تو بچے کی فریاد ہے اور نہ منطقی ربط سے تہی۔یہ مربوط سلسلہ کلام ہے اور اس میں نہایت حسنِ ترتیب و تنظیم کے ساتھ مسلم تاریخ اور ان کے عہد بہ عہد کارناموں کی داستان پیش کر کے شکوے کا رنگ ابھارا گیا ہے۔''شکوہ'' اور '' جوابِ شکوہ'' کے ربط و تنظیم کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

''جہاں تک پوری نظم میں تمام اشعار کے درمیان ارتباط کا تعلق ہے،دونوں حصوں کے مابین باہمی تنظیم منصوبۂ نظم ہی سے ہویدا ہے اور اس منصوبے کی تعمیل بھی اس ارتباط پر دلالت کرتی ہے۔چناں چہ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی مطابقت تو واضح ہے۔لیکن ہر دو حصے میں الگ الگ ارتقائے خیال اس نقطۂ نظر سے تلاش کرنا عبث ہے کہ کوئی ایک نقطہ یا مضمون نظم کا موضوع ہے اور سارے اشعار اسی کے ارتقا کا سامان کرتے ہیں،البتہ نظم کا جو عمومی تخیل ایک ملت کی مرقع سازی اور خاکہ نگاری پر مشتمل ہے وہ شروع سے آخر تک اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ موضوعِ تخیل ہے اور فن کاری کے سارے پیچ و خم اسی مرکزی نقطے کے گرد نمایاں ہوتے ہیں۔خیالات اور احساسات ایک روانی اور تسلسل کے ساتھ مربوط طریقے پر رونما ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں ارتقائے خیال کی رفتار اتنی تیز ہے کہ قاری کے لیے دم مارنا مشکل ہوتا ہے۔''(۴)

''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' چوں کہ سوال اور جواب یا مکالمہ اور جوابِ مکالمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کے اسلوب میں فرق کا ہونا قدرتی بات ہے۔''شکوہ'' میں شوخ طبعی،بے باکی اور بلند آہنگی ''جوابِ شکوہ'' کی نسبت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔''شکوہ'' انسان کے متلاطم سینے سے اٹھی ہوئی آواز ہے جب کہ ''جوابِ شکوہ'' خدا کی آواز کا اظہار یہ ہے،اس لیے دونوں کے درمیان فرق کا ہونا ناگزیر ہے۔''شکوہ'' میں شوخ طبعی اور بے باکی یک لخت نہیں بڑھتی بل کہ بتدریج بڑھتی ہے۔شوخ طبعی کے ارتقا کو دکھانے کے لیے ایک دو بند ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خو گرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

تُجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا، اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے سجایا کس نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں

متذکرہ بالا بند پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بند میں اگرچہ شکوہ کا اسلوب موجود ہے مگر اس کے تیور تیز نہیں، اس میں تندی اور سختی نہیں جو دوسرے بند میں نسبتاً نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ دوسرے بند میں بڑھ بڑھ کر بولنے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر بات کرنے کا انداز ابھرتا ہوا سامنے آیا ہے۔ تیسرا بند اس کیفیت کو مزید بڑھاوا دیتا ہے۔ اس بند میں باقاعدہ لڑنے جھگڑنے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور آخری مصرعے کی تلخ نوائی تو باقاعدہ تو تکار تک لے آتی ہے۔ ''شکوہ'' میں جذبات کا تموج لحظہ لحظہ بڑھتا اور تیز ہوتا جاتا ہے جب کہ ''جوابِ شکوہ'' کا اسلوب ایک خاص نوع کے ٹھہراؤ، متانت اور تناسب کا مظہر ہے۔

''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کے بارے میں کچھ نہ کہنا زیادتی ہو گی۔ یہ نظمیں جیسا کہ معلوم ہے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان سناتی ہیں، ان نظموں میں مسلم تاریخ کے عظیم الشان واقعات اور عہد بہ عہد ان کا روحِ مذہب سے دُور ہو کر زوال کا شکار ہونا، بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ کو شعر گوئی کے لبادے میں اس طرح ڈھالنا کہ شعریت ہاتھ سے نہ جائے، مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اقبال نے اپنی غیر معمولی قدرتِ کلام کے باعث اس ناممکن اور مشکل کو ممکن اور سہل بنا دیا ہے۔ یہ نظمیں اگرچہ اقبال کے تشکیلی دور کی یادگاریں ہیں تاہم ان میں جابجا تکنیک اور فن کے وہ معجزے دکھائی دیتے ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ لفظیات کا انتخاب، تراکیب سازی، پیکر تراشی، منظر نگاری، تشبیہات و استعارات کی ندرت، کنایات و اشارات کی ہمہ رنگی، صنائع و بدائع کی برجستگی، محاورے اور روزمرے کی رنگارنگی، مصرعوں کا دروبست، ردیف و قوافی کا محلِ استعمال، شعروں کا ارتباط اور بیان کی صفائی ایسے پہلو ہیں جو الگ کئی دفاتر کے متقاضی ہیں۔ دونوں نظمیں نغمگیت اور موسیقیت کے حسنِ دلآویز کی مظہرِ کامل ہیں۔ تکرارِ الفاظ و حروف، حروفِ علت کے معجزانہ استعمال، ردیف و قوافی کی جھنکار اور بحر کے انتخاب نے ان نظموں کو نغمے کا بدل بنا دیا ہے۔

''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' اقبال کی ابدتاب نظمیں ہیں اور فکرِ اقبال کی کامل پیش کش کا نقشِ جاوید۔ افسوس! کہ ان نظموں میں موجود پیغام کی روح کو سینوں میں اتارنے میں مسلمانوں نے غفلت برتی ہے۔ اس غفلت کیشی اور تغافل شعاری کا نتیجہ ہے کہ مسلمان آج بھی پورے عالم میں ذلت و رسوائی، درماندگی و بے چارگی اور زبوں حالی

وکم مائیگی کا نقش بنے ہوئے ہیں۔اس لحاظ سے یہ نظمیں آج کے حالات وواقعات میں بھی امتِ مسلمہ کی رہبری وسمت نمائی کا فریضہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ایک صدی گزر جانے کے باوجود ان کی تازگی وتوانائی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔یہ نظمیں نہیں، حکیمِ مشرق اور دانائے راز کے قلب وجگر کا لہو ہیں اور انھیں زمانے کی گرد سے کوئی باک نہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

حوالہ جات:

(۱) عبدالمغنی،ڈاکٹر: اقبال کا نظامِ فن؛(لاہور؛اقبال اکادمی پاکستان؛دوم،۱۹۹۰ء)ص ۲۳۴،۲۳۳۔

(۲) مشفق خواجہ (مرتب):اقبال(لاہور؛اقبال اکادمی پاکستان؛طبعِ چہارم،۲۰۰۶ء)ص ۱۸۴۔

(۳) نثار احمد قریشی،ڈاکٹر:علامہ اقبال:صوفی تبسم کی نظر میں(لاہور؛اقبال اکادمی پاکستان؛۱۰۹۳ء)ص ۱۱۱۔

(۴) اقبال کا نظامِ فن؛حوالہ محولہ بالا؛ص ۲۳۹۔